ڈاکٹر پروفیسر محمد عارف خان

# زندگی میں اقتصادیات کا مسئلہ

دُنیا دی ہر مشکل تائیں دولت کرے آسانی
ڈاڈے کفل اُتارے، اے وی کنجی ہے رحمانی
جہناں پیسہ پلّے نہ ہی، خالی مڑن بازاروں
نقد نصیب محمد بخشا پیسے نہیں داروں
[میاں محمد بخش]

(۱)

میرے مدنظر مسلمان کہلانے والی قوتوں کا زوال ہے اور دوبارہ عروج کے لیے فکرمندی ہے۔ مسلمانوں نے عروج پایا تو اُس وقت، جب انہوں نے دو طاقتوں کو پالیا:

۱۔ معاشی طاقت، ۲۔ عسکری طاقت

معیشت یا اقتصادیات کی اصطلاحیں آج کی طرح شاید استعمال نہ ہوتی ہوں گی مگر ہم تو آج کے دور میں رہ رہے ہیں اور زمانہ حاضر کی اصطلاحیں مستعمل ہوں گی۔ اس میں ذرا برابر شک نہیں ہونا چاہیے کہ اقتصادی کنٹرول اور عسکری قوت مسلمانوں کے پاس آ گئی تھی۔ وہی عروج تھا اور جب یہ نہیں رہیں تو زوال ہو گیا۔ ایک طویل مدت گزر گئی اور مسلمان کہلانے والی قوتوں کو سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ وقت کے تقاضوں پر کنٹرول کیسے اختیار کریں؟

(۲)

جن قوموں یا قوتوں نے ''وقت'' یعنی عصرِ حاضر کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے، اُن کے پاس اب تین طاقتیں ہیں:

۱۔ معاشی طاقت، ۲۔ عسکری طاقت، ۳۔ ٹیکنالوجی کی طاقت

جن قوتوں نے یہ طاقت حاصل کی ہیں، یقیناً اُس میں دوسری قوموں کے خلاف مخاصمت و دشمنی کے جذبات ہوں گے، فتح و شکست کے تصورات ہوں گے، مذہبی چپقلش یا صلیبی جذبہ کارفرما ہوگا۔ یہ سب انسانی و قومی آلائشیں ہیں اور یہ مسلمانوں میں بھی پائی جاتی رہی ہیں۔ میرے خیال میں ان موضوعات پر قلم آرائی تاریخ کا پیٹ بھرنے کی مشق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اصل شے وہ اُمید و اُمنگ ہے جو انسان کو انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی باقی رہنے اور آگے بڑھنے کا نصب العین دے۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کا داعیہ تب پیدا ہوتا ہے جب آپ کے پاس مطلوبہ معاشی طاقت، عسکری طاقت اور عصرِ حاضر میں جدید ٹیکنالوجی کی طاقت ہو۔

(۳)

درج بالا سطور میں طاقت کے تصور کو عیاں کرتے ہوئے دو خصوصی عناصر کا تذکرہ نہیں کیا اور یہ جان بوجھ کر نہیں کیا کہ وہ ہیں:

۱۔ معاشرتی و سماجی طاقت، ۲۔ سیاسی طاقت

دراصل یہ دونوں طاقتیں گذشتہ سطور میں مذکور تینوں طاقتوں کی بنیادیں ہیں یا دوسرے لفظوں میں معاشی طاقت، عسکری طاقت اور ٹیکنالوجی کی طاقت نتائج ہیں جو ایک منظم معاشرہ اور منظم سیاسی حکومت کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں۔

مسلمان قوموں کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہی معاشرتی اور سماجی ڈھانچہ کی کمزوری ہے اور اُس بنا پر غیر منظم سیاسی نظام سے بالا ہے۔ مسلم دُنیا کا معاشرتی ڈھانچہ جب

تک انسان دوست رہا، منظم رہا اور اُس کے نتیجے میں سیاسی نظام بھی منظم رہا، یوں اس نظم سے مسلمانوں نے معاشی کنٹرول حاصل کیا اور عسکری طاقت منظم کیے رکھی۔

(۴)

دُنیا میں زندگی تین مرحلوں پر نبرد آزما ہے۔ ہر مرحلے پر کامیابی شرط ہے۔ تینوں مرحلوں پر اپنی نوعیت کے مسائل ہیں۔ یہ تمام مسائل چلتی گاڑی پر حل ہوتے ہیں۔ یہاں ستانے اور رُکنے کا سوال نہیں، جو ست ہوا، یا رُکا تو چلتی گاڑی سے گر جائے گا اور وہ اُٹھے گا تو کیسے؟ یہ ایک سوال ہے۔

**پہلا مرحلہ:** زندگی کے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے راستوں میں حائل مسائل ملکی سطح پر یعنی معاشرے میں داخلی سطح پر موجود ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے خالصتاً ایک قومی رویہ کا تعین ضروری ہے۔ مسلمان ہوں گے تو قومی رویہ کی تشکیل میں اسلامی اصولوں اور سماجی رویوں کو بنیاد بنایا جائے گا اور عصری تقاضوں سے نبٹنے کی حکمتِ عملی مرتب کی جائے گی جبکہ دوسرے مذاہب وسماج کے لوگ اپنے اصولوں کو بروئے کار لائیں گے۔

**دوسرا مرحلہ:** مسائل کی ایک سطح بین الاسلامی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ مسلمان ملکوں میں یہ ہے کہ نتیجہ خیز رابطہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان ملک اپنی وطنی حدود کی مناسبت سے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے اور یوں مکالمہ بے نتیجہ رہتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالیہ صورت میں مسلم ملکوں کے سربراہان کا انتخاب وہاں کے عوام نہیں کرتے بلکہ مغربی ممالک کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسلم ملکوں کا ٹھوس رابطہ خوب ہی معلوم ہوتا ہے۔

**تیسرا مرحلہ:** بین الاقوامی سطح پر امورِ سرانجام دینا جدید دُنیا کی ایک ضرورت ہے۔ مسلم ممالک جس سلیقے یا بدسلیقگی سے مسائل حل کرتے ہیں یا الجھاتے ہیں، سب کچھ اسلام کے کھاتے میں آتا ہے۔ اور ہے بھی درست۔ اسلام کا جو نقشہ ہمارا کردار پیش کرتا ہے، اسلام تو وہی شمار ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل چاہے وہ اپنے علاقے، معاشرے یا ملک میں روا رکھا جاتا ہے یا بین الاسلامی اور بین الاقوامی سطح پر سامنے آتا ہے، اسلام کا موقف ہی تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اسلام تو مسلمانوں کے رویوں اور کردار ہی سے پہچانا جائے گا۔

(۵)

مسلمان جو کچھ کرتا ہے، دُنیا کے نزدیک وہی اسلام ہے۔

سوال یہ ہے کہ:

مسلمانوں کا طرزِ عمل مسلم ملکوں میں کتنا انسان دوست ہے؟

مسلمانوں کا طرزِ عمل غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں اور غیر مسلموں سے کتنا انسان دوست ہے؟

مسلمانوں کا معاشرتی عمل انصاف، تعلیم اور صحت کے لیے کتنا معاون ہے؟

مسلمانوں کا سیاسی نظام عوامی شرکت کا کتنا آئینہ دار ہے؟

مسلمانوں کا اقتصادی نظام کتنا مضبوط اور غریب پرور ہے؟

مسلمانوں کو ٹیکنالوجی کی دریافت اور استعمال میں کتنی مہارت ہے؟

مسلمانوں کا عسکری طاقت میں کیا مقام و مرتبہ ہے؟

مسلمانوں کی طرف سے زندگی کے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے کتنا حصہ ادا ہو رہا ہے؟

ان سوالوں کے جواب مثبت نہیں اور ہم دُنیا کے کسی معیار پر پورا نہیں اُتریں گے۔ ان تمام میدانوں میں ہمارا معیار قطعی غیر معیاری ہے۔ کسی پیمانۂ معیار پر ہم پورا نہیں اُترتے۔ ان سوالوں کا جواب مسلمانوں کے خلاف جاتا ہے۔ جب مسلمانوں کے خلاف جاتا ہے تو اسلام کے خلاف بھی جاتا ہے کیونکہ اسلام تو بہر حال مسلمانوں کے کردار و رویے سے ہی پہچانا جائے گا۔

اگر مسلمانوں نے باقی رہنا ہے اور آگے بڑھنا ہے، زندگی کو حرکت دینی ہے اور دُنیا

کو اس فریضے سے آگاہ کرنا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضۂ نبوت کی صورت میں سپرد کیا تھا تو دُنیا کو قریب سے دیکھنا ہوگا۔ دُنیا جو بھی ہے، جیسی بھی ہے۔ آج کی ہے یا کل کی ہوگی، انسان کا میدان وہی رہے گا۔ نبوی فریضہ جو آپ ﷺ نے سرانجام دیا، اس دُنیا کے انسانوں کے اندر رہ کر دیا ہے اور کارِ نبوت جو اُمت کے افراد کے ذمہ لگا ہے۔ وہ محض اس دُنیا کے لیے ہے۔ آپؐ نے غارِ حرا کی تنہائی میں جو پایا اُسے دُنیا میں ظاہر کیا۔ انسان کو زندگی کی اُمید، اُمنگ اور ولولہ عطا کیا۔ انسان کو آگے بڑھنے کی تڑپ دی۔ باقی رہنے کا عزم عطا کیا۔ کسے معلوم نہیں کہ انسان کی زندگی کی ایک عمر ہے اور بہت محدود عمر ہے۔ اگر یہ سارا سلسلہ اتنا ہی ناپائیدار اور کھوکھلا ہے تو نبیوں کی آمد کا مطلب نہیں رہتا۔ ہر نبی نے بھی تو محدود عمر پائی۔ ہر انسان محدود عمر پاتا ہے۔ لیکن سمجھنا اور جاننا یہ درکار ہے کہ زندگی جو کائنات کی رگوں میں دوڑتی ہے، ایک لحاظ سے یہ بھی عارضی نہیں ہے۔ انسانی زندگی دراصل حقیقی زندگی کے لیے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے اپنے حصہ کا کام کر کے جاتی ہے۔ یعنی ناپائیدار زندگی بھی دراصل زندگی ہی کو پائیدار بناتی ہے اور خود امر ہو جاتی ہے۔

(۶)

تحفظ و احیاء کی کہانی ہو یا نئی سمت و حکمتِ عملی کی بات ہو یا زندگی کو آگے بڑھانے کی صلاحیت کو زیرِ بحث لانا ہو، یہ طے ہے، حتمی ہے، قطعی ہے کہ ایک بنیادی سوال تلاش کرنا ہوگا، جس کا جواب فراہم کرنے کی منصوبہ بندی قائم کرنی ہے۔ یہ سب سوال ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں مگر جس بنیادی سوال سے سب جُڑے ہوئے ہیں وہ اقتصادیات کا مسئلہ ہے۔ اور وہ سوال ہے:

اقتصادیات کیا ہے؟

اقتصادیات کا مسئلہ کیا ہے؟

اقتصادیات میں طاقت ور کون ہے اور کیوں ہے؟

اقتصادیات جدید کی تعریف، اہمیت و مقام کیا ہے؟
اقتصادیات کا جدید نظام کیا ہے؟
اقتصادیات میں قرآن کا موقف و مقصود کیا ہے؟
اقتصادیات میں مسلمان قومیں کمزور و دست نگر کیوں ہیں؟
اقتصادیات کا انسانوں کے طرزِ عمل سے کیا تعلق ہے؟
اقتصادیات کا انصاف، تعلیم اور صحت سے کیا واسطہ ہے؟
اقتصادیات میں مسلمانوں کا نظام کیا تھا اور یہ کب زوال پذیر ہوا اور کیوں ہوا؟
اقتصادیات کا سیاسی نظام کے استحکام سے کتنا تعلق ہے؟
اقتصادیات کا ٹیکنالوجی سے کیا تعلق ہے؟
اقتصادیات کا عسکریت سے کیا واسطہ ہے؟
اقتصادیات کا زندگی کے باقی رہنے اور آگے بڑھنے سے کیا تعلق ہے؟

ان سوالات کا تفصیلاً جواب فراہم کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، مگر اقتصادیات کے جدید نظام کو اس انداز سے بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تمام سوالوں کے جوابات نہ سہی، سوچنے کا مواد فراہم ہو جائے۔ یوں بھی یہ ایسے سوالات نہیں جن کا جواب مجھ سے یا چند احباب سے طلب کیا جائے۔ یہ سبھی کے سوالات ہیں، سبھی کے سوچنے کے میدان ہیں۔ تبھی تو جا کر کوئی حل نکلے گا۔ میرے جوابات، میرے جوابات ہیں۔ اُنہیں نظرانداز کیجیے، اپنے جوابات لائیں۔ غور و فکر کریں۔ اپنے احیاء کو دیکھیں۔ اپنے کو باقی رکھنے کا لائحہ عمل دیں۔ آگے بڑھنے کے لیے اُمید، اُمنگ اور ولولہ دیں۔

(۷)

## مغربی اقتصادیات کی تعریف

اقتصادیات/ معاشیات/ اکنامکس (Economics) ایک خصوصی اصطلاح ہے جو

مختصر الفاظ میں زر کا نظام ہے۔ لیکن جس طرح یہ میدان وسیع ہوا ہے، اکنامکس کی تعریف میں بھی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اکنامکس کی اس تعریف میں وسعت اُن اقوام کے ہاں ہوئی ہے جنہوں نے اس کا آغاز کیا اور اس کے میدان کو وسیع کیا۔ اس ساری بحث میں مسلم اقوام وحکما کا کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ مسلم اقوام اور اس کے علماء وحکماء کو ابھی سود حلال ہے اور سود حرام ہے کی اصطلاح کے تعین میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے مسلم اقوام اکنامکس کی تعریف اور میدان سے لاتعلق رہ کر غلامی اور گداگری پر تکیہ کیے بیٹھی ہیں۔

اکنامکس پر گزشتہ صدی میں جتنا لکھا گیا اور جتنا کام ہوا، تاریخ کی ایک نئی مثال ہے۔ یہاں اس مضمون کی وضاحت کے لیے ۱۹۲۹ء کی شائع ایک کتاب Elements of Economics کا حوالہ دوں گا جو Evelyn Thomas نے لکھی۔ اُس کے مطابق اکنامکس اُن مادی اشیاء سے متعلق ہے جو ہمارے اردگرد ہیں اور ہماری سہولت کے لیے ہیں اور اُن مقاصد کے حصول کے لیے کوشش درکار ہے۔ انفرادی حیثیت میں یہ مادی اشیاء گھر میں موجود اشیاء کے علاوہ، باغ میں یا فارم وغیرہ میں ہوں۔ بظاہر یہ انفرادی دولت (wealth) ہے اور یوں اکنامکس کی تعریف یہ ہوئی:

> "Economics is that body of knowledge or that science, which considers the actions of man in relation to wealth."[1]

یہی مصنف اس تعریف کو مزید وسعت دیتا ہے:

> "Economics, therefore, is a body of scientifically arranged knowledge, based on work and investigations of scholars and thinkers of many periods and of many climes."[2]

اکنامکس، دولت کی سائنس ہے۔ آدم سمتھ اکنامکس کو کسی قوم کی دولت کو مقاصد و نوعیت کی تحقیق قرار دیتا ہے۔ Beverdge کے نزدیک اکنامکس عمومی طریق کار ہے جس کے ذریعے انسان اپنی مادی ضروریات پوری کرتا ہے۔ Pigou کے نزدیک اکنامکس سماجی بہبود

کے مقاصد کے تحت دولت کی پیمائش و انداز ہے۔ Marshall کے نزدیک مادی ضرورتوں کو بہتر انداز سے پوری کرتا ہے۔ دولت (wealth) مقصد نہیں ہے، انسانی بہتری مقصود ہے۔

(Wealth is sought for promoting human welfare, hence wealth is relegated to a secondary position.)

اور مزید یہ کہ اکنامکس عام آدمی و عورت کی بہتری کے لیے ہے۔ اکنامکس سماجی بہبود کی سائنس ہے، اور یہ لوگوں کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا لائحہ عمل فراہم کرتی ہے۔ اکنامکس کو نظام کی صورت میں بیان کرنے کے لیے کئی اصطلاحات جنم لے چکی ہیں۔ کئی میدان سامنے آ چکے ہیں۔ دولت کمانے، دولت لٹانے، دولت لوٹنے، دولت ہتھیانے کے کئی طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ Distribution, Exchange, Production, Consumption اس نظام کے حصے ہیں، جن کے لیے خصوصی معاشی قانون بنائے جاتے رہتے ہیں۔ انسان کے اندر لامتناہی ضرورتوں اور خواہشات کی ایک تحریک رواں رہتی ہے۔ یہ دراصل تحفظِ زندگی کا ایک جذبہ ہے۔ دولت کا استعمال اسی جذبے کو زندہ رکھنے کا نام ہے اور پیداوار کا بھی یہی استعمال ہے۔

اکنامکس کو سائنس قرار دینے اور سائنسی تنظیم کی طرف بڑھانے کا آغاز آدم سمتھ (Adam Smith) کی کتاب Inquiry into the Nature and Causes of the wealth of Nations کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب 1776ء میں شائع ہوئی۔ ایسا نہیں ہے کہ جدید اکنامکس یعنی علمِ اقتصادیات کی بنیاد ہے بلکہ سابقہ کام کو زیادہ نظم دے کر نمایاں کیا گیا ہے۔ اقتصادی سائنس کو اس کے بعد بینتھم (Bentham) اور مالتھس (Malthus) نے آگے بڑھایا جو اکثریتی افادہ (Utilitorian School) کے بانی کہلائے۔ بینتھم نے منافع (Interest) کے دفاع میں کام کیا جو قبل ازیں سخت قوانین کی گرفت میں تھا۔ ریکارڈو (Ricardo) نے آدم سمتھ کے بعد اکنامکس سائنس کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ اس ضمن میں اُس کی کتاب

Principles of Political Economy and Taxation (1817) معروف ہے۔ جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) نے Principles of Political Economy لکھ کر آدم سمتھ کے کام کو آگے بڑھایا اور اپنے وقت کو بھی مدنظر رکھا۔ مل کے بعد اکنامکس سائنس نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ کارل مارکس، ہیگل رائڈبرٹز اور یسزل کا کام خصوصاً جرمنی میں نمایاں ہوا۔ ڈاکٹر مارشل اس رو میں Unification of Economics کے تحت نمایاں کردار کا مالک ہے۔

اقتصادیات (Economics) نے سائنسی تنظیم حاصل کی تو یہ ایک نظریہ بن گیا اور سیاسی حکومتوں کو اس کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہونا پڑا یوں اکنامک سائنس کیپٹلزم (Capitalism) اور سوشلزم (Socialism) میں تقسیم ہوئی۔ دونوں میں بنیادی فلسفہ انسان کا تحفظ، ذرائع زندگی کی آسانی دستیابی اور خوف وغم سے نجات تھی۔ مقاصد نیک ہوں، نظریہ درست ہو اور اُس پر عمل اُس کی روح کے مطابق ہو جو عموماً ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود نتائج سو فیصد متوقع نہیں ہوتے۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسان کی سائنسی ترقی اور اقتصادی سائنس کے نتائج حیران کن ہیں۔ ایک دُنیا تھی جو بدل دی گئی۔ بدلی دُنیا میں بھی کئی مسائل اُبھرے مگر آگے بڑھنے کے عمل کو اوّلیت حاصل رہے گی۔ مسائل ہر موڑ پر اُبھریں گے اور اُن کا حل بھی اُس وقت کا انسان ہی تلاش کرے گا۔ جیسے کیپٹلزم اور سوشلزم کے عمل کو مشترکہ اقتصاد (Mixed Economy) میں بدلا جا رہا ہے۔

کیپٹلزم میں تمام کھیت، فیکٹری اور تمام ذرائع پیداوار پرائیویٹ طور پر کسی شخص کی ملکیت ہوں گے۔ آہستہ آہستہ ریاستوں نے عوامی بہبود کے تحت کچھ پابندیاں بھی لگا رکھی ہیں۔ پروفیسر لوکس (Loucks) نے برطانیہ، امریکا اور یورپ میں جاری اکنامکس سائنس یعنی کیپٹلزم کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا کہ

''سرمایہ داری نظام (کیپٹلزم) اقتصادی تنظیم کا ایسا نظام ہے جس کے کرداروں

میں پرائیویٹ ملکیت اور انسان کے ذریعے حصول منافع اور جائز سرمایہ ہے۔''

کیپٹلزم میں اہم نکات جو عمومی طور پر سامنے آتے ہیں، اُن میں پرائیویٹ پراپرٹی کا حق، کاروبار کی آزادی، منافع میں دلچسپی، صارف (خرچ کرنے والے) کو انتخاب کی آزادی، طبقاتی تقسیم کا پیدا ہونا، غیر منظم اکنامک سرگرمیاں، تاجر کا کردار، مقابلہ کا رجحان، قیمتوں کا تعین اور معاشی ناہمواری جیسے نکات شامل ہیں۔ یہ نظام اب زیادہ تر ملکوں میں رائج ہے۔ اس کو آہستہ آہستہ عوامی فلاح و بہبود کے تصور کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔ سوشلزم نے کیپٹلزم کی خامیوں کو اُجاگر کیا۔ وہ انفرادی حقِ ملکیت کے بجائے اجتماعی حقِ ملکیت کا نظریہ دیتا ہے۔ مساوات کو اقتصادیات کے ہر میدان میں لاگو کرنا چاہتا ہے۔ سوشلزم ریاستی ملکیت کا دعویدار نہیں ہے بلکہ اجتماعی عمل پیداوار کا حامی ہے۔ البتہ بڑے اداروں کو ریاستی ملکیت میں دینے کے مخالف بھی نہیں ہے۔ اقتصاد کو سماجی بہبود کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ انفرادی منافع خوری کے لیے۔ سوشلزم بنیادی طور پر کیپٹلزم کے نظام میں خاطر خواہ تبدیلیاں چاہتا تھا۔ ڈکنسن (Dickenson) نے "Economic of Socialism" شائع شدہ 1939ء میں کہا کہ سوشلزم معاشرہ کی ایک اقتصادی تنظیم ہے جو یہ اصرار کرتی ہے کہ پیداواری سرگرمیاں سارے معاشرے کی ملکیت ہونی چاہیں اور پیداواری سرگرمیاں تنظیمی نمائندوں کے ذریعے ہونی چاہیں اور تمام کو مساوی حق حاصل ہو۔ جبکہ 1946ء میں لوکس (Loucks) نے "Comparative Economic System" میں بیان کیا کہ سوشلزم انفرادی سرگرمیوں کے بجائے اجتماعی سرگرمیوں اور مقاصد کو اُجاگر کرتا ہے۔

کارل مارکس (Karl Marx, 1818-1883) نے داس کیپٹل لکھی اور شہرت پائی۔ اسے سوشلزم کی بائبل کہا گیا۔ مارکس نے سوشلزم کے نظریہ کو سائنسی بنیادوں پر بیان کیا۔ سوشلزم کے تحت جو نکات سامنے آتے ہیں، اُن کے مطابق پیداوار پر سماجی گرفت، پرائیویٹ کاروبار پر پابندی، معاشی مساوات، مواقع میں مساوات، معاشی منصوبہ بندی، غیر طبقاتی سماجی

بہبود اور سماجی تحفظ شامل ہیں۔

۔کیپٹلزم و سوشلزم کی گفتگو کے دوران ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکماء کا اسلامی نقطۂ نظر بھی بیان کیا جائے تا کہ موضوع کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا نکتہ نظر یہ ہے:

''جہاں تک جدید معاشیات سے استفادہ کرنے کا تعلق ہے، یہ جاننا ضروری ہے کہ معاشی تخلیق تعاون کا عمل ہے اور یہ عمل فرائض کی بجا آوری کے ضمن میں جائز مفادات کی تکمیل پر منحصر ہے۔ قرآن نے ہر معاشی نظام کو بعض بنیادی تصرفات کے ساتھ اپنایا اور اسے اسلامی بنایا تھا۔ جب سے ہمارے ہاتھ سے معاشی انقلاب کی قیادت چھنی ہے ہم مفلوج ہو کر رہے گئے ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے جواب میں اسلامی نظامِ معیشت کا نعرہ لگانے والے یہ نہیں سمجھتے کہ معاشی نظام طریقِ پیداوار سے متعین ہوتے ہیں اور طریقِ پیداوار آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ ہر معاشی نظام تاریخی موثرات کے تحت غالب یا مغلوب ہوتا ہے۔ اگر اسلام نے گلہ بانی نظام، تجارت نظام، سرمایہ داری نظام، زرعی نظام اور جاگیرداری نظام کی اصلاح کر کے ان نظاموں کو اپنایا تو آج کا ہمارا معاشی مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکی نظاموں میں کس انداز کا تصرف انہیں اسلامی بنا سکتا ہے؟ وہ تصرف یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حقوق کے درمیان جو تصادم سرمایہ داری اور اشتراکی نظام ہائے معیشت میں اس وجہ سے رفع نہیں ہوتا کہ مطالبہ حقوق کے اصرار سے سرمایہ دارانہ معیشت میں محنت کشوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور اشتمالی معیشت میں اجتماعی حقوق پر اصرار کے باعث انفرادی حقوق کی نفی کی جاتی ہے اور اسلام فرائض کی بجا آوری پر اصرار کر کے حقوق کے درمیان تصادم کو رفع کرتا ہے۔''[۱]

تازہ صورتِ حال میں یہ دونوں نظام اپنی خوبیوں کے ساتھ یکجا ہوں گے اور یورپ کم از کم اس تازہ صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ اسے مکسڈ اکنامکس کا نام دیا گیا

ہے، حالانکہ سرد جنگ کا زمانہ دونوں نظاموں کے تحت ایک شدت پسندی کا دور تھا۔ دراصل مقصد محض جنگ نہ تھا بلکہ انسان، سماج اور قوم و ملک کو ترقی دینا تھا۔ اس مقصد کے لیے نظام اپنانے سے نظریاتی کشمکش جو اقتصادیات میں در آئی تھی اُس کا خاتمہ ہو گیا اور جو مقاصد اقتصادی حوالے سے حکیم انسانوں نے حضرت انسان کے لیے متعین کیے تھے، اُن کے حصول میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔ اُردو میں مغربی حکماء پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ معاشیات کی تاریخ کا جائزہ جارج سول کی کتاب ''عظماء کے معاشی نظریات'' (ترجمہ) میں دیکھا جا سکتا ہے۔[۲] گذشتہ چار پانچ صدیوں میں اقتصادیات کی اس نظریاتی جنگ میں مسلمان اقوام یا حکماء کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ اس نظریاتی جنگ میں مسلمانوں کی شرکت نہ سہی کہ کوئی ضروری نہ تھا کہ یورپی اقوام کی جنگ میں شریک ہوں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان اقوام نے اپنے اپنے ملکوں میں اُس رعایا کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ رعایا انسان بھی تھی اور ہے۔ تمام مسلمان ملکوں کی رعایا کا اکثریتی طبقہ غربت، افلاس، بیماری اور ناانصافی میں جکڑا ہوا ہے۔ علما نے بعض اوقات حکمرانوں پر جو تنقید کی تو محض اس قدر کہ وہ صحیح حکمرانی نہیں کرتے اور غربت و لاچار رعایا پر جب بھی برسے تو یوں کہ یہ لوگ اسلام پر عمل نہیں کرتے۔ اس لیے غربت اور ناانصافی کا شکار ہیں۔ پچھلی چار پانچ صدیوں میں اسلامی دُنیا میں مذہبی علما اور امرا اور بادشاہتوں کا قبضہ رہا ہے۔ یہی لوگ غلط اور صحیح مسلمان ہونے کی سند جاری کرتے رہے ہیں، حالانکہ مسلمان تو مسلمان ہے اور کافر نہیں ہے تو پھر یہ سند بازی اور فتویٰ بازی کیا معنی رکھتی ہے۔

(۸)

کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اقوام دراصل معاشرتی و سماجی زوال کو روکنے اور دوبارہ مستحکم کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات کو راسخ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر اس کوشش کے نتائج تو منفی طور پر زیادہ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ لاقانونیت و جرائم کی روز افزوں ترقی، غیر اخلاقی و غیر انسانی رویّے، غربت و پسماندگی کا بڑھتا ہوا بوجھ اور غیر منظم و بے ربط زندگی کا

سفر مسلم ملکوں کے معاشروں کی عکاسی ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ خود فریبی ہے کہ ہم اسلام نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سوال ہے کہ کون نافذ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسلام نافذ کرنے کا ایک آپشن ہے جو اُس وقت اطلاق پذیر ہو سکتا ہے جب قوتِ نافذہ حکمتِ اسلام سے پوری طرح آگاہ ہو۔ موجودہ دور میں ایسی قوتِ نافذہ شاید ہی کسی مسلم ملک میں ہو۔

میں بار بار آپ کو تاریخ میں لے جانا نہیں چاہتا۔ آپ جو موجود ہیں اور جس حالت میں موجود ہیں۔ یہی حقیقت ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالتِ زار معیار دُنیا کے مطابق درست نہیں ہے۔ اسلام کا مقصود موجودہ معیار سے بہتر معیار مہیا کرنا ہے۔ آج کی دُنیا میں کرنا ہے۔ مسلم ملکوں اور غیر مسلم ملکوں کے دوران تفاوت و معیار کو درست کرنا ہے۔ یہ اجتماعی ذمہ داری ہے اس کا نسخہ قرآن ہے۔ قرآن کی ارتقائی فکر کا حاصل جانیں یا یوں سمجھیں کہ قرآن کو دوبارہ وہ کردار ادا کرنا ہے جو اُس نے آپؐ پر نزول کے وقت ادا کیا تھا۔ یہاں بعض نازک سوال جنم لیتے ہیں کہ:

(۱) قرآن نے اُس وقت کے محدود عرب معاشرے میں تبدیلی کو بتدریج روشناس کرایا تھا؟

(۲) آپ ﷺ نے عرب معاشرے کی ہر شئے کو تبدیل کیا یا محض تہذیب و اصلاح کی؟

(۳) قرآن سے اخذ و استنباط اور اطلاق و اصلاح کی قیادت خود نبی ﷺ نے کی جبکہ اب وہ موجود نہیں ہیں تو قرآن سے اخذ و استنباط کیسے ہوگا اور اصلاح کیسے ہوگی؟

(۴) کیا یہ درست ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نبوت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آئندہ کا فریضہ نبوت انسان کی بالغ نظری و بصیرت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ کیا واقعی انسان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنے معاملات کو خود آگے بڑھا سکے گا۔

ان سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں اپنے آپ پر اعتماد کرنا ہوگا کہ ہم ہی وہ اُمت کے افراد ہیں جو موجودہ دُنیا کے اندر خرابیوں اور ناہمواریوں کو قرآنی فکر و بصیرت

کے بل بوتے پر آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روح کے مطابق درست کرنے کی حکمت دے سکتے ہیں۔ پیغمبرانہ حکمت کے مطابق تہذیب و اصلاح کا عمل جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے یہ یقین بھی درکار ہے کہ آپ ﷺ نے قرآنی وحی کی روح کے مطابق انسانوں و معاشروں میں اصلاح و تہذیب کا جو عمل شروع کیا تھا، وہ انسان کی ترقی و ارتقاء کے ساتھ جاری رہے گا۔ یہ پچھلی صدیوں میں بھی اپنے انداز سے جاری رہا ہے۔ اسے جاری رکھنا اُمت کے موجودہ بالغ و بابصیرت اشخاص کے ذمہ ہے۔

اصلاح و تہذیب موجود و حاضر میں ہوتی ہے۔ دُنیا جیسی اب ہے۔ مسلم ممالک کی جو موجودہ حالت ہے اور باقی دُنیا کی صورتِ حال جیسی ہے وہی حقیقت ہے۔ وہی ہمارا میدان ہے۔ اُمت کو قرآن کی فکر سے لیس ہو کر اور محبتِ رسول ﷺ سے سرشار ہو کر اس دُنیا موجود کے تمام مثبت اقدامات و اشیاء کو درست قرار دے کر انسان کی بصیرت و بالغ نظری کی حوصلہ افزائی کرنی ہے اور اُسے جاری رکھنے میں مدد کرنی ہے اور تمام موجود منفی اشیاء و اقدامات کو دلیل و برہان سے انسان پر عیاں کرنا ہے۔ اُس کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔ منفی پراپیگنڈہ اور کفر کی بلاوجہ فتویٰ بازی اسلام کے خوبصورت تاریخی چہرے کو اپنے ہاتھوں سے خود مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

مسلمان اقوام موجودہ اقتصادی نظام کے میدان میں بتدریج اُسی طرح داخل ہوئی ہیں جس طرح باقی اقوام کا عمل رہا ہے۔ موجودہ اقتصادی نظام سے پہلے بھی دُنیا کا ایک اقتصادی نظام تھا، مسلمان اقوام اُس میں بھی برابر کی شریک تھیں بلکہ ایک رائے کے مطابق اُس نظام کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی جو بعد ازاں برطانیہ نے لی اور پھر اب برطانیہ سے باقی دُنیا کو بھی منتقل ہوگئی اور اب امریکہ کے ہاتھوں میں اس کی زیادہ بھاگ ڈور ہے۔

موجودہ اقتصادی نظام سے قبل جاگیردارانہ زراعت و کھیتی اور جنگی مالِ غنیمت پر مشتمل نظام تھا اور کاغذی نوٹوں کے اجراء سے قبل بھی تھا اور اس کے بعد بھی جاری رہا ہے۔

شکل ونوعیت تبدیل ہوتی رہی ہے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ یہ نظام بھی ساری دُنیا میں تھا۔ مسلم ملکوں اور غیر مسلم ملکوں میں یکساں رائج رہا ہے۔ مواصلات کا جدید نظام نہ تھا۔ زندگی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی۔ اور اب ایک دُنیا ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔

ظلمت و استحصال سابقہ اقتصادی نظام میں تھا اور اب بھی ہے لیکن اب کم ہے۔ زیادہ تر انسان بہتر ہوا ہے۔ بہتری کی طرف جا رہا ہے۔ مسلم ملکوں میں یہ رفتار بہت سست ہے کیونکہ علماء کے نزدیک غربت و پسماندگی کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہ اقتصادی حالت کی بہتری کو اسلامی مقصد سے خارج رکھتے ہیں۔

(۹)

## مقاصد کا نئے سرے سے تعین

- مسلمان ملکوں کو اجتماعی طور پر مقاصد کا نئے سرے سے تعین کرنا ہوگا۔
- مسلمان حکماء کو موجود دُنیا میں جاری اقتصادی نظام کے اندر اپنی ایمانی قوت کی بنا پر شرکت کو ممکن بنانا ہوگا۔
- قرآن نے کوئی باقاعدہ معاشی نظام روشناس نہیں کرایا ہے بلکہ جاری معاشرت و معیشت میں تہذیب اصلاح کے غیر معمولی اور آفاقی اُصول فراہم کیے ہیں۔
- مسلمانوں کو اس تذبذب سے نکالنا ہوگا کہ اسلام کا کوئی الگ سے اقتصادی نظام ہے۔ نظام وہی ہوتا ہے جو ساری دُنیا میں جاری ہوتا ہے۔ البتہ اُس میں اصلاح و تہذیب دُنیا کا ہر ملک و خطہ سرانجام دے سکتا ہے اور مسلمانوں نے یہ کیا ہے اور آئندہ بھی کر سکتے ہیں۔
- اسلام کا الگ سے کوئی اقتصادی نظام وضع نہیں ہوا اور جاری نظاموں میں مسلمان اپنی ایمانی قوت سے داخل ہوتے رہے ہیں لیکن مسلمان ممالک اب یا جب کبھی چاہیں تو اقتصادیات کے موجودہ علم پر گرفت رکھنے والے دانشور حضرات اور حکماء و

علماء کی مدد سے اپنے لیے نیا اقتصادی نظام وضع کر سکتے ہیں۔

- جدید اقتصادی نظام میں سب سے بڑی تبدیلی کاغذی نوٹ اور صنعتوں کا قیام ہے۔ سائنس کی ترقی نے صنعت کو ترقی دی اور کاغذی نوٹ کا پھیلاؤ اس قدر ہوا کہ یہ خود ایک صنعت بن گئی۔ ایک ملک کے نوٹوں کا دوسرے کے نوٹوں سے تبادلہ ہوتا ہے۔ پہلے صرف بینکوں کی اجارہ داری تھی اب ہر کونے پر کرنسی کی دُکان کھلی ہے۔

(۱۰)

متکلم قرآن[۵] بن کر مومنانہ بصیرت پا کر آیاتِ ربا کا مطالعہ درکار ہے۔ مطالعہ کا ابتدائی پہلو آیاتِ قرآن کی تعبیر وتشریح ہے جو عرب کے مخصوص سماج کے پس منظر میں نازل ہوئیں۔ یہ براہِ راست خطاب ہے۔ اُس وقت کے ایک غیر انسانی پہلو کی نشاندہی ہے۔ اس حکم کی بنیادی وجہ یا علت انفرادی سطح پر معیاری قرض کا اجرا تھا جو بوقت اجرا جائز تھا اور انسان دوست تھا مگر بروقت ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایسی پیچیدگی اختیار کر لیتا تھا کہ بوقت اجراء جائز کی حدود سے نکل کر ناجائز ہو جاتا اور انسان دوست کے بجائے انسان دشمن صورت اختیار کر لیتا۔ اسلام انسان کی شعوری ترقی و بلندی میں ان سرگرمیوں کو رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ اس لیے ابتدا سے ہی یہ حکم جاری کر دیا کہ استحصالی اور غیر انسانی قرض جائز نہیں ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے:

(۱) کہ کیا یہ حکم ایک مخصوص طریقۂ قرض پر تھا جس سے کوئی صورت فلاح سے وابستہ نہ تھی یا قرض دینے پر مکمل پابندی عاید کر دی گئی تھی۔

(۲) انفرادی سطح پر معیاری قرض کی یہ صورت کیا اب بھی باقی ہے اور اس کا تناسب کیا ہے؟

(۳) قرآن کی آیت کا ایک بڑا حصہ انسانیت کی تکمیل میں کیا مکمل نہیں ہو گیا اور

استحصال و غیر انسانی صورتیں اُس جیسی نہیں رہیں جیسے عرب معاشرے میں نازل تھیں اور جن سے چھٹکارے کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں۔

(۴) قرض کی انفرادی نوعیت جس پر کسی اتھارٹی کا کوئی کنٹرول نہیں تھا، کیا اب بھی ویسی ہی صورت ہے؟[۶]

(۵) ریاستوں کی منظم صورت آنے کے بعد کیا قرض لینے اور دینے کے معاملات میں ایک کنٹرولنگ اتھارٹی وجود میں نہیں آ گئی ہے۔ دُنیا کی تمام ریاستوں بمعہ مسلم دُنیا کا مقصد وجود غریب و مظلوم کی دادرسی ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے۔

متکلم قرآن بن کر مومنانہ بصیرت کی روشنی سے عصرِ حاضر کے بازارِ قرض، بینکوں کے طریقِ کار، کمپنیوں کی اجارہ داری اور ریاستی اتھارٹی کا مطالعہ درکار ہے۔ عرب کا معاشرہ ابتدائی افکار کا میدان تھا اور آج کا معاشرہ انہی افکار کا ترقی شدہ میدان ہے۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے عرب کے معاشرے کو بھلانا ہوگا اور یہ سمجھنا ہوگا کہ دُنیا رُکتی نہیں ہے اور نہ رُکنے کا نتیجہ آج کی جدید دُنیا ہے۔ اس جدید دُنیا کی تعمیر میں قبل از نبوت محمد ﷺ اور بعد از نبوت تمام انسانوں کا کم و بیش حصہ ہے۔ یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ موجودہ دُنیا کی تعمیر خدا کے منشاء کے خلاف ہوئی ہے بلکہ یہ یقین رکھنا از بس ضروری ہے کہ کوئی حرکت خدا کے منشاء کے خلاف ممکن نہیں ہے۔

اُمت آخری ہے اور بہترین ہے جس کا کام نیکی کی تلقین اور بدی سے منع کرنا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ میدانِ معیشت و اقتصادیات میں جہاں کہیں استحصالی رویہ اور غیر انسانی سلوک کا معلوم ہو تو اس کو درست کرنے کے لیے پاکیزہ نظام کے تصور کو اُجاگر کیا جائے۔ اقتصادیات کا میدان پہلے جیسا نہیں ہے بلکہ قطعی نیا ہے۔ دُنیائے جدید نے اسی نظام کے ساتھ ترقی کی ہے۔ خامیاں ہر نظام کا حصہ ہیں۔ اُمت دُنیائے جدید کے نئے نظام سے استفادہ کر سکی اور نہ اسے درست کر سکی۔ یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اُمت کو آگے بڑھنا ہے تو

میدانِ اقتصادیات میں ترقی کرنی ہوگی۔

موجودہ دور کے بازارِ قرض کی صورت یہ ہے کہ اُمت یا دوسری اقوام کا کوئی شخص یا کمپنی یا ملک ایسا نہیں ہے جو موجودہ بازارِ قرض کا مُمبر نہ ہو۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے جو نظام وضع کرنا ہے، وہ اسی بازارِ قرض کے اندر رہ کر تلاش کرنا ہے۔ متکلم قرآن کی مومنانہ بصیرت کے ساتھ علم جدید کے اقتصادی نظریے کی حکیمانہ توجیہہ درکار ہے۔ کام ضرور ہو رہا ہے، اسے مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔

(۱۱)

اقتصادیات سے متعلق قرآن میں طویل مضمون البقرۃ، ۲۶۱ تا ۲۸۳ بیان ہوا ہے۔

آیت ۲۶۱ میں انسانیت کی راہ (فی سبیل اللہ) میں فالتو خرچ کرنے کی روحانی و اُخروی فوائد و اطمینان کی بات کی گئی۔ انسانیت کی بنیاد پر استوار معاشرہ کی خوبی بیان کی گئی ہے کہ وہ لوگ فی سبیل اللہ مال خرچ کرتے ہیں۔ اس وصف کی مثالیں عصرِ حاضر کے ناہموار معاشرے میں بھی موجود ہے۔ یہ ایک سماجی وصف ہے۔ اس کا زر کے نظام سے براہِ راست تعلق پہلے تھا نہ اب ہے۔

آیت ۲۶۲ تا ۲۶۷ تک یہی مضمون جاری رہتا ہے۔ دوسروں یعنی کمزور انسانوں کی دلجوئی کی ترغیب ہے۔ انسان دوست بننے کا درس ہے۔ یہ انفرادی کردار کی بطور سماجی کردار کی نشاندہی ہے۔ نہ ریاستی تذکرہ ہے اور نہ حکم۔ انسانی تربیت میں دوسرے کی حاجت روائی کو بہت زیادہ مقام سے نوازا گیا۔ روحانی و اُخروی فوائد و اطمینان کی بات بھی ہوئی اور مال کے نقصان کا تذکرہ بھی ہوا۔ ''**ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون.**'' کے الفاظ آیت ۲۶۲ میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بہت جامع پیغام ہے۔ انسان خوف و غم سے پاک اپنی ذات، اپنے سماج اور اپنی ریاست کو دیکھنے کا متمنی رہا ہے اور رہے گا۔ دوسری طرف موت کے بعد کی زندگی کا بھی یہی پیغام ہے۔ یعنی یہ آیات دُنیوی و آخری زندگی کے معاملات کا احاطہ کرتی ہے۔

آیت ۲۶۸ میں غربت و مفلسی کا نتیجہ ابرو سے جوڑا گیا ہے۔ مفلسی کو ردّ کیا گیا ہے۔ مفلسی کو کمزوری اور بے بسی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ انسانی نفس مفلسی کو برداشت نہیں کرتا تو وہ اسے امیری میں بدلنے کے لیے ناجائز، غیر قانونی اور غیر انسانی کاموں میں پڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کسی سماج میں یہ ہونا اُس سماج کی بے حسی کے ساتھ اُس میں بگڑنے کے خطرات کی نشاندہی ہے۔ ریاستی سطح پر اس بات کا اہتمام لازمی ہے کہ انسان مفلسی کے ہاتھوں غیر قانونی اور غیر انسانی کاموں پر نہ اُترے۔

آیت ۲۶۹ تا ۲۷۴ میں مفلسی کے عیوب کے تذکرے کے بعد دوبارہ انسانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ مفلسی کے مارے لوگوں کی اعلانیہ وخفیہ حاجت روائی کریں اور اپنا سماجی تعمیری کردار ادا کریں۔ ریاستی نظام کی صورت میں ریاست کے کارندوں کا ہاتھ بٹائیں اور خوف وغم سے پاک ریاست قائم کرنے میں اپنی کوشش شامل کریں۔ خوف وغم کی یہ آیات اسی مضمون میں دوسری دفع آئی ہیں جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ غریبوں ومفلسوں کی حاجت روائی سے اطمینان وسکون ملتا ہے۔

آیت ۲۷۵ میں ربا کی حرمت بیان ہوئی ہے مگر تجارت کو اسی سے الگ رکھا اور جائز قرار دیا۔ مفلس کو سماجی رویوں کی تکلیف سے بچانا جہاں ریاست کی ذمہ داری ہے، وہاں افراد کی ذمہ داری بھی ہے۔ گذشتہ آیات کے تسلسل میں سماج میں جاری ایک ظالمانہ بیماری کی قرآن حکیم میں باقاعدہ نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں مخاطب عرب کا موجود معاشرہ تھا۔ ریاستی ڈھانچہ قبائلی طرز کا تھا۔ باقاعدہ ریاستی ڈھانچہ کی بنیاد ''میثاقِ مدینہ'' کے تحت رکھی گئی تھی۔ قرض کا لینا دینا افراد کا انفرادی فعل ہوتا تھا۔ قرض معیاری اور قرض فاضلہ کا رواج تھا۔

یہ قرض مفلس کی مفلسی کا بعض اوقات زیادہ باعث ہوتا تھا۔ قرض پر اضافی رقم مخصوص حالات میں ظالمانہ حد تک غیر انسانی سطح تک چلی جاتی تھی۔ انسان کی یہ حالت کسی طور پر کسی سماج میں باعثِ طمانیت نہیں ہوسکتی، چہ جائیکہ اسلام خوف وغم سے پاک معاشرے

کا وجود چاہتا ہے اور پچھلی آیات میں انفرادی طور پر انسان کو اپنے مظلوم و مفلس بھائیوں کی مدد کے لیے آگے بڑھنے کی ترغیب دی ہے۔

مسلم ادب میں یہ نزع سماج کا حصہ بن گیا کہ کیا یہ حرمت محض عرب معاشرے میں موجود طریقِ ربا یا سود کے لیے تھی یا اس کا اطلاق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر قسم کے قرض پر منافع پر ہوتا ہے۔ چاہیے کہ مسلم علماء، فقہاء اور حکماء نے انفرادی مہاجنی سود کے برعکس خصوصاً ریاست یا ریاستی چھتری تلے تجارتی قرض کے اوپر زائد واضافی کو جائز قرار دیا ہو۔

آیت ۲۷۶ میں دوبارہ ربا اور صدقات کی بات ہوئی۔ مذکورہ ربا کے خاتمہ کا اُس وقت بھی یہی طریقہ تجویز کیا گیا کہ صدقات دے کر ربا میں پھنسے لوگوں کو چھڑایا جائے۔

آیت ۲۷۷ میں اہلِ ایمان کی صورت گری کی گئی ہے اور تیسری دفعہ خوف وغم سے نجات کا نسخہ بتایا گیا ہے۔ آیت ۲۷۸، میں بھی خطاب اہلِ ایمان سے ہے جن کو مثالی مسلمان بننے کے لیے رہ جانے والا سود معاف کرنے کی تلقین وترغیب ہے۔ واضح طور پر ربا کا معاملہ اُس وقت کے عرب معاشرے کا ناسور تھا اور ان کی آیات کا آج بھی اطلاق اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو شخصی یا مہاجنی سود کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ اسی آیت میں ربا کی لعنت ختم کرنے کی اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے مسلسل جدوجہد کو آگے بڑھانے کا حکم ہے۔ شخصی و مہاجنی سود کے خاتمے کے قوانین زیادہ تر ریاستوں نے تشکیل دے رکھے ہیں، اس کے باوجود یہ دھندہ اب بھی موجود ہے اور اسے کوئی ریاست پسند نہیں کرتی بلکہ برطانیہ جیسی ریاست نے تو مکان اور نان نفقہ کے لیے نقد رقم دینے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ دھندہ زیادہ تر بنیادی ضرورت کی قیمت پر چلتا ہے۔ آیت ۲۷۹ تا ۲۸۵ گذشتہ آیات میں قطعی انسانی بنیادوں پر انسانی رویوں کی تشکیل پر بات ہوئی، جس کا مرکزی نقطہ زر نقد، مفلسی اور اضافی رقم (سود) سے جنم لینے والی ناہمواری کا تفصیلی تذکرہ تھا۔ تجارت پر زور دیا گیا اور سود سے دُور رہنے کی تلقین کی گئی۔ صدقات و خیرات کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اقتصادی ترقی کے

لیے اخلاقی جواز کو مرکزی حیثیت دی گئی۔

- اقتصادی ترقی کے لیے اخلاقی جواز کو سرِ فہرست رکھنے کے بعد اس کے طریق کار میں تبدیلی کی نشاندہی کی گئی۔ تمام طرح کے لین دین کو دستاویزی صورت دینے کی یہ تلقین اس انداز سے شاید تاریخ میں قبل ازیں ہو۔ یہ قرآن و اسلام کا ایک اور طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے ہر قسم کے لین دین کو باقاعدہ بنانے کا حکم دیا۔ تم کسی کو دیتے ہو اور تم کسی سے لیتے ہو، معیاد و اعداد و شرائط کو باقاعدہ دستاویز پر لکھنے اور اُس پر گواہ رکھنے کی تلقین ہے۔ یہ بات نزولِ قرآن کے عرصے کی ہے۔ عرب میں باقاعدہ ریاست کا وجود نہ تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ ایک لحاظ سے گویا یہ آج کے بینکنگ نظام کی ابتدائی شکل تھی۔ بینک یہی کچھ کرتا ہے جو دستاویز لکھنے میں ہوتا تھا۔ بینک آج باقاعدہ معاشی اصولوں کے مطابق ایک زبردست تنظیم ہے، دُنیا کے تمام زر کا مرکز بینک بن گئے ہیں بلکہ لوگ سونا اور دوسری امانتیں بھی اس تنظیم کے حوالے کر رہی ہیں۔

(۱۲)

مفسرین نے حسبِ روایت آیات کے مفہوم کو براہِ راست بیان کیا ہے۔ بعض الفاظ و اصطلاحوں کی نحوی و صرف تشریح کے ساتھ معنی بھی تعین کیا گیا۔ جیسے تدبر القرآن، میں ایسا کیا گیا اور یہ قرار دیا گیا کہ مقصد قرض یا قرضدار کی نوعیت و حیثیت کی تبدیلی ربا کی عرضی حیثیت کو نہیں بدلتی ہے۔ رفاعی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام پر بھی قرض معیادی اور منافع جائز نہ ہوگا۔ امین احسن اصلاحی نے اس موقف کی تردید کی ہے جو مفسرین و حکماء کے ایک گروہ نے یہ قرار دیا کہ زمانہ عرب میں مہاجنی سود تھا۔ غریب و نادار اپنی ناگزیر ضرورت کے لیے مہاجنوں سے قرض لیتے تھے اور مہاجن ان سے بھاری سود لیتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے حرام ٹھہرایا ہے۔ تجارتی قرضے جن کا اس زمانہ میں رواج ہے۔ اُس زمانے میں ایسا دستور نہ تھا اور نہ وہ زیرِ بحث آیا۔ اصلاحی صاحب نے اگلی آیات میں قرض

لینے والوں کو اور دینے والوں کو نقصان اور نزاع سے بچانے کے لیے جو ہدایات دی گئی ہیں۔ اُن کو مجموعی زر کے نظام سے جوڑنے کے بجائے محض قرضِ حسنہ کے لیے بیان کیا ہے۔

سود کی حرمت کے بعد قرض کو تحریر کرنے کی ہدایت کا مقصد قرض کی شرائط کا بیان یقیناً کسی زرعی نظام کی بنیاد ہے۔ ان آیات میں لین دین کا ذکر ہے۔ قرضِ حسنہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ صدقات کی تلقین ہے۔

مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں ''ربا'' یا ''سود'' کی حرمت پر قرآنی دلائل کو بیان کیا ہے۔ اقتصادی لائحہ عمل اور نظام کی جو نشاندہی ان آیات میں بطور راہنمائی کی گئی ہے۔ اُس طرف نہیں گئے حالانکہ مولانا صاحب کو موجودہ مسائل کے حل کی طرف جانے کے لیے ایک بہتر عالم و مفسر خیال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے تجارتی اور مہاجنی سود یا منافع میں امین احسن اصلاحی کی طرح فرق نہیں کیا۔ البتہ اگلی آیات میں قرض اور تجارتی قراردادوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔

سیّد قطب شہید نے بھی قرآن کی ان آیات کی تفسیر میں محض سودی نظام کی حرمت پر زور دیا ہے۔ موجودہ دور میں کسی اقتصادی نظام کی بات نہیں کی۔ اُنہوں نے بھی ربا میعادی اور ربا فاضلہ کو یکساں ہی رکھا ہے۔

پیر کرم شاہ نے چند سوالات ضرور اُٹھائے ہیں مگر اُن کی تعبیر بھی یہی ہے کہ قرآن نے ہر ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ کہیں آپ کاروباری سود لینے کی اجازت نہیں دکھا سکتے ہیں۔

علماء و مفسرین کا یہ موقف ہی عام ہے۔ اس موقف کی موجودگی میں تمام کاروباری قرض اور منافع کا بھرپور نظام مسلم و غیر مسلم ممالک میں جاری ہے۔ غیر مسلم ملکوں نے اسے ریاستی تحفظ دے کر اپنے شہریوں کو بے پناہ اطمینان دیا ہے جبکہ مسلم ممالک نے اس نظام کو ریاستی سطح پر اجازت دے کر بے اطمینانی کے سوا کچھ نہ دیا ہے۔ یہ حق بہرحال مسلمانوں کا اٹل ہے کہ وہ بھی غربت سے نجات چاہتے ہیں اور ہمارے علماء و مفسرین اور ریاستی حکمران قرآن کی اس تعبیر و

تشریح سے کاروبار اور تجارت کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں حالانکہ قرآن نے تجارت کو جائز قرار دے کر معاشی خوشحالی کی بنیادیں رکھیں۔ قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کرنے سے جو چیز سامنے آتی ہے، وہ یوں ہے کہ انفرادی مہاجنی اضافی رقم کو ربا قرار دے کر ہمیشہ کے لیے حرام اور مضر قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ مہاجنی فعل تب بھی انسانی ہمدردی سے خالی تھا اور آج بھی ہے۔

دوسری طرف تجارت کے منافع کو کم و بیش کے ساتھ جاری رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ تجارت لین دین کا نام ہے۔ تجارت نقصان ہی کا نام نہیں ہے۔ نقصان ایک احتمال ہے۔ اس کا لازمہ حصہ نہیں ہے۔ تجارت کا لازمہ حصہ تجارت میں منافع ہے۔ سماج کا رحم دل شخص کم منافع کمائے گا۔ اس کے برعکس دوسرا زیادہ منافع کما سکتا ہے۔ اس پر پابندی نہیں ہے۔ لین دین میں اجناس اور زر استعمال ہوتی ہے۔ تجارت میں قرض کا لین دین بھی اس کا حصہ ہے۔

(۱۳)

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جلا
ہم جہاں ہیں، وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک، آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

مقاصدِ شریعت کیا ہیں جن کا حاصل ہونا شرط ہے۔ عصرِ حاضر میں مقاصدِ شریعت حاصل نہیں ہو پا رہے۔ جدید اقتصادی نظام کیا مقاصدِ شریعت کی راہ میں رکاوٹ ہے یا مسلمانوں میں کسی بھی اقتصادی نظام کی عدم موجودگی رکاوٹ ہے؟ مقاصدِ شریعت کے حصول میں گزشتہ تاریخ میں کونسے دور مثالی ہیں یا یہ معاملہ معرضِ ارتقاء میں ہے؟ مقاصدِ شریعت کے حصول میں غریب اقوام کامیاب ہوتی ہیں یا خوشحال اقوام۔ یہ اور اس طرح کے بہت سارے سوالات جنم لیتے ہیں۔ ان پر ہمہ وقت غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مقاصدِ شریعت کے حصول میں اقتصادی نظام کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ اس بات کو

بیان کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ یہ جانا جا سکے کہ روپے پیسے کی فراوانی سے مقاصدِ شریعت کے حصول کے لیے معاشرتی تنظیم کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مقاصدِ شریعت کو ابتداً پانچ مقاصد میں محدود کیا گیا جبکہ اب یہ تعداد بڑھ چکی ہے۔

کسی ریاست یا معاشرہ کے مقاصد متعین ہوں تو انسان اُن کے حصول کی تربیت پا کر آگے بڑھتا ہے اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ مقاصد کا تعین و اضافہ ہوا ہے۔ ریاستیں زیادہ منظم ہوئی ہیں۔ معاشرے مشکلات سے سبق پا کر زیادہ بہتر ہوئے ہیں۔

مسلم حکماء نے قرآن و حدیث سے استنباط اور فقہی و قانونی عرق ریزی سے مسلم ریاستوں کے لیے مقاصدِ شریعت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ امام الجوینی (۴۷۸ھ/ ۱۰۸۵ء) نے اس طرف توجہ مبذول کی۔ ان کے شاگرد امام غزالی نے واضح الفاظ میں بیان کیا۔ دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت اولین قرار پائی۔[۷] ابواسحاق شاطبی (م ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء) نے انہیں برقرار رکھا اور اضافے کی تجویز بھی رکھی۔

موجودہ دور کے اقتصادی نظام اور مسلمانوں کی معاشرتی و ریاستی حیثیت وصورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ان حکماء کے نتیجۂ فکر کو بھی مدنظر رکھا جانا چاہیے جو ایسی صورت سے نبٹنے کا لائحہ عمل دیتے ہیں۔ امام غزالی نے مقاصدِ شریعت کے حصول میں مصلحت/ مصالح کا اصول روشناس کرایا ہے اور شاطبی نے اس کے ساتھ عقل کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ غزالی کے مطابق مصلحت سے مراد شریعت کے مقاصد کی حفاظت ہے۔ مذکورہ پانچ مقاصد کی حفاظت کے لیے مصلحت کو اصول قرار دے کر آئندہ کی اجتہادی بصیرت کو راہِ عمل دی۔ امام غزالی سے قبل امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ/ ۷۹۶ء) ''مصلحت مرسلہ'' اور امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء) استحسان جیسے اصولوں کا تعارف کرا چکے تھے۔

اوّلین طور پر پانچ مقاصدِ شریعت کو مزید وسعت دیتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ:

دین، عقل، جان، نسل اور مال کی حفاظت کے ساتھ، ابرو یعنی انسانی عزت و شرف، بنیادی آزادیاں، عدل و انصاف، ازالۂ غربت اور کفالتِ عامہ، سماجی مساوات، دولت و آمدنی میں تفاوت کو دُور کرنا، امن و امان، نظم و نسق اور بین الاقوامی سطح پر باہم تعامل اور تعاون شامل ہے۔ یہ سب مقاصد معتبر ہیں۔[۸] دین، جان، عقل، نسل اور مال میں اضافہ کو عصرِ حاضر کی روشنی میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے:

- کسی بھی انسان کی اقتصادی ضرورتیں کیا ہیں؟
- زندگی کی حفاظت
- ابرو کی حفاظت
- روٹی، کپڑا اور مکان کی سہولت
- انصاف کی فراہمی
- صحت پر توجہ
- آزادئ رائے کا احترام
- معاشرتی نظم و نسق
- امن و سکون کو معاشرتی سطح پر ممکن بنانا
- آفاقی گاؤں کے لیے باہمی تعاون

مقاصدِ شریعت کے سابقہ تعین، موجودہ اضافہ، عصرِ حاضر کی ضرورت اور تقاضے، دفع مضرت پر زور اور جلب منفعت کو نظر انداز کرنا، مصالح مرسلہ، اجتہاد کی تازہ ضرورت، نئے اجتہاد میں مقاصدِ شریعت کا مقام، خواتین کے کردار کی موثر بحالی جیسے معاملات کو باقاعدہ اصول و ضوابط سے متعین کیا جا سکتا ہے۔

علماء و حکماء کے درمیان اپنے اپنے زمانہ میں، اپنے اپنے علاقوں میں، اپنے اپنے عرف و عادات میں اور اپنے اپنے رہن سہن و معاشرت میں اختلاف و بحث انفرادیت اور

آزادی کا ایک لازمی پہلو ہے۔ شرط یہ ہے کہ مقاصدِ شریعت کا حصول مقصد ہو۔ خصوصاً پیش آمدہ حالات کو سمجھنے میں اختلاف یا قرآن حکیم کو سمجھنے میں اختلاف یا فیصلہ جات میں اختلاف کو دراصل زبان، زمان، مکان اور وقت کے الفاظ بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ جغرافیائی طور پر مختلف علاقوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ درجۂ حرارت، رات دن کی لمبائی میں کمی بیشی، بارش کی کمی بیشی اور اُس کا زمینوں اور موسم پر اثرات، لباس وضع قطع، مکانوں کی ساخت اور اُن میں مسلسل تبدیلی بڑی وجوہات ہیں۔ آبادی میں اضافہ، نقل وحمل اور مواصلات کا نیا تیز ترین نظام، نئے پیداواری رشتوں کی تنظیم اور سب سے بڑھ کر علم کی سائنسی ترقی کی جہت نمایاں تبدیلیاں ہیں۔ گویا یہ ایک نئی دُنیا ہے اور نیا فہمِ قرآن درکار ہے جو انسانوں کو سیاسی، معاشی، تہذیبی معاشرتی سکون اور خوف وغم سے پاک زندگی کی ضمانت دے۔[۹]

ماحول کا تجزیہ اور قرآن وسنت کی طرح رجوع اس لیے ضروری ہے کہ ہم موجودہ حالات میں آگے بڑھنے کے لیے کیا کریں؟ مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی بنا پر کسی کو سفر سے نہ روکا جائے، آگے بڑھنا شرط رہے۔ تبدیلیاں بہت تیز ہیں اور ہمارا فہمِ قرآن اور تنظیمِ فکر بہت سست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زمانے کی رفتار سے بہت پیچھے ہیں۔[۱۰]

(۱۴)

زندگی گزارنے کے لیے وقت، زمان، مکان کی نسبت سے اجناس یا نقد زر ایک بدیہی امر ہے۔ اجناس یا نقد زر کا حصول ہر دور میں وقت کی مناسبت سے پیداوار اور اشیاء سے وابستہ رہا ہے۔ اجناس کا تبادلہ کم ہوا اور نقدی زر بصورت کرنسی نوٹ عام ہو گیا۔ اس کے لیے ریاستی منظوری سے انویسٹمنٹ کمپنیاں، بینک، سٹاک ایکسچینج اور انشورنس کمپنیاں وجود میں آ گئیں۔ رفتہ رفتہ یہ مالیاتی نظام اعلیٰ قسم کے علم کا محتاج ہو گیا۔ جن ریاستوں نے اس علم کو پا لیا، اُنہوں نے موجودہ مالیاتی نظام پر اجارہ داری قائم کر لی ہے اور ابھی تک تیسری دُنیا اور مسلم ممالک اجارہ دار مالیاتی نظام کے تحت کراہ رہے ہیں۔ اس کی دو واضح وجوہات ہیں:

(الف) مسلم ریاستوں نے جدید علمِ معاشیات کو حاصل کرنے میں قطعی دلچسپی نہ لی اور اجارہ دار مالیاتی نظام کو روک بھی نہ سکے اور اقتصادی ترقی نہ ہوسکی اور غربت میں اضافہ ہوگیا۔ غریب قومیں مالیاتی غلامی میں چلی گئیں۔

(ب) دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ متبادل نظام کے طور پر مسلم ریاستوں میں کام نہیں ہوا۔ انفرادی طور پر ملائشیا اور انڈونیشیاء نے قدم بڑھائے اور آج وہ قدرے بہتر صورت میں ہیں۔

اسلامی مالیاتی نظام اب اس کوشش تک رسائی حاصل کر رہا ہے کہ منافع پر مبنی بینک لوگوں کو جو خدمات دے رہے ہیں، ویسی ہی خدمات لوگوں کو اسلامی بینک کاری کے تحت دیں۔

آج کے تازہ اسلامی بینکاری نظام میں امام ابوحنیفہؒ کا فقہی اصولِ اجتہاد ''استحسان'' اور امام مالک بن انسؒ کے فقہی اجتہاد کا ضابطہ ''مصالح مرسلہ'' زیادہ نمایاں ہو رہا ہے۔ محمد نجات اللہ صدیقی نے بیان کیا ہے:

(الف) مصالحہ مرسلہ یا مصالحہ عامہ سے مراد خصوصاً مالی امور میں، اقتصادی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی مسائل ہیں۔ آج کے علماء وحکماء کو ان اصولوں کی روشنی میں فیصلہ کرتے وقت اس سے وابستہ مصالح و مفاسد کا موازنہ کرنا ضروری ہے۔

(ب) یہ موازنہ روایتی مدارس میں نہیں سکھایا جاتا اور نہ یہ مدارس کے نصاب میں شامل ہے اور نہ ہر عالم فقیہہ کے لیے ان علوم پر مہارت حاصل کرنا ممکن ہے۔ سو یہ ضروری ہے کہ اس سے مختلف طریقہ اختیار کیا جائے۔[۱۱]

(ج) نظامِ زر کی تشکیلِ نو ریاستی سطح پر درکار ہے، نجی سطح پر اس کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔[۱۲]

(د) مصنف کے خیال ہے کہ قرض پر مبنی بازارِ قرض کا وجود اسلامی معیشت کا جزو نہیں بن سکتا۔ اس کا متبادل سرمایہ کاری ہے۔ قرض کے بغیر نظامِ زر کا تصور ایک مشکل

سوال ہے۔

(ر) کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ عام انسانوں سے ہمارا تعلق محض دعوت دینے سے ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عام انسانوں سے خوش تعلقاتی، ان کی خدمت، حاجت روائی، دست گیری، ان کی دلجوئی جیسے رویے مطلوب ہیں۔

(س) مسلمانوں کا جو رویہ مطلوب ہے۔ اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے کہ کسی انسان نے اپنے لیے کون سا دین پسند کیا اور کونسا مذہب پسند کیا ہے۔[۱۳]

(ص) ایک وقت میں کیے گئے فیصلے آگے چل کر، وقت گزرنے پر، تجزیہ کی روشنی میں یا نئے دلائل کے پیشِ نظر بدلے جا سکتے ہیں۔[۱۴]

ڈاکٹر محمود احمد غازی[۱۵] نے اس موضوع پر لکھا ہے:

قرآن مجید کے طالب علم کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قرآنِ مجید اجتماعی، اقتصادی اور مادی معاملات کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے زیادہ اعتنا کرتا ہے۔ معاملات کے خالص انتظامی اور دُنیاوی پہلوؤں کے مقابلہ میں قرآنِ پاک کی زیادہ دلچسپی ان امور کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے ہے۔ یقیناً معاملات کے دُنیاوی اور مادی پہلو قرآن کریم نے نظرانداز نہیں کیے، لیکن ان سے قرآن کریم کی دلچسپی جزوی ہے۔[۱۶]

## حواشی وحوالہ جات

[۱] ایلین تھامس، Eliments of Economics، ۱۹۲۹ء، ص ۱۔

[۲] ایضاً، ص ۲۔

[۳] ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، روزنامہ نوائے وقت، ۹۔ فروری ۱۹۷۸ء۔

[۴] جارج سول (George Soule)، Ideas of the Great Economics، اُردو ترجمہ ڈاکٹر ایس ایم اختر، ۱۹۶۰ء، الائیڈ پریس، ۲۶۔ مال، لاہور۔ مجلس ترقی ادب نے اسے شائع کیا۔

[۵] متکلم قرآن سے مراد ''علم کے راستوں کا ہدایت نامہ جب قرآن ہوگا تو انسان کو متکلم قرآن بنا ہے اور یہی متکلم قرآن النبیینؐ کی نبوت کا مقصد اور اُس کی شان ہے۔'' مزید دیکھیے مولف کی کتاب،

''علوم القرآن- مطالعہ قرآن کا ضابطہ''۔

[۶] ایک آدمی دوسرے سے رشتہ داری یا دوستی کی بنا پر بغیر سود کے رقم لیتا ہے اور معیاد کے اندر واپس نہیں کرتا۔ معاملہ آگے بڑھتا ہے تو کسی معین تاریخ کا بینک چیک جاری کیا جاتا ہے اور چیک کیش نہیں ہوتا۔ معاملہ عدالت میں جاتا ہے اور مقروض گرفتار ہو کر کہتا ہے کہ اُس کے پاس رقم ہی نہیں ہے اور قرض دینے والا اپنی رقم سے ہاتھ دھو ڈالتا ہے۔ ایسی صورت میں قرضِ حسنہ کا ماحول اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ متبادل صورتیں بہر حال تلاش کرنی ہوں گی۔

[۷] امام غزالی، المستصفی فی اصول الفقہ، ترجمہ۔

[۸] ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مقاصدِ شریعت، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، ص ۲۱۔

[۹] ایضا، ۱۱۹۔

[۱۰] ایضا، ۱۲۸۔

[۱۱] ایضا، ۲۱۸۔

[۱۲] ایضا، ۲۳۲۔

[۱۳] ایضا، ۲۵۲۔

[۱۴] ایضا، ۲۸۷۔

[۱۵] ڈاکٹر محمود احمد غازی کا انتقال ۲۰۱۰ء میں ہوا ہے۔ اسلامی یونیورسٹی کے صدر اور وفاقی وزیر بھی رہے ہیں۔ اُن کی کتاب ''محاضرات معیشت و تجارت'' حال ہی شائع ہوئی ہے۔ اس مقالہ کی تحریر مکمل ہونے کے بعد یہ میری نظر سے گزری ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر مقالہ کے آخر میں دُنیا ضروری خیال کیا ہے۔ وہ عصر حاضر کے ایک بیدار مغز و باشعور عالم و حکیم تھے۔

[۱۶] محمود احمد غازی، محاضراتِ معیشت و تجارت، افیصل، لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۔

---